بے جڑ کا درخت

سیّد ولی اللہ

بے جڑ کا درخت

سید ولی اللہ

مشعل
آر-بی 5 ' سیکنڈ فلور' عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک' نیو گارڈن ٹاؤن' لاہور54600 ' پاکستان

MashalBooks.com

MashalBooks.com

دیباچہ

ناول ''بے جڑ کا درخت'' کے مصنف سید ولی اللہ بنگلہ زبان کے مشہور تخلیق کار ہیں۔ برصغیر کی آزادی کے بعد بنگال نے جو بڑے افسانہ اور ناول نگار پیدا کئے۔ ان میں سید ولی اللہ بہت اہم ہیں۔

ان کے فن کی نشوونما اس دور میں ہوئی جب ٹیگور اور سرت چٹر جی دونوں کا انتقال ہو چکا تھا اور وقتی طور پر بنگلہ ادب، خصوصاً افسانوی ادب میں انحطاط کے آثار پیدا ہوئے تھے۔ لیکن بنگال کے قحط، آزادی کی جدوجہد اور ترقی پسند قوتوں کے ابھرنے کی وجہ سے صورت حال تیزی سے بدلی۔

جن بنگالی ادیبوں نے سید ولی اللہ کو متاثر کیا ان میں پربھات کمار مکر جی، بدھا دیو بوس، پریندرا مترا اور سالک بندوپادھیا نے جیسے عظیم ادیب شامل ہیں لیکن جس ادیب نے ولی اللہ کے فن پر سب سے گہرا اثر کیا وہ یقیناً سرت چٹر جی تھی۔ اپنی انسان دوستی اور دیہی علاقوں کی عمدہ عکاسی کے لئے سرت کا بنگلہ ادب میں وہی مقام ہے جو اردو میں منشی پریم چند کا ہے۔

بہرحال ولی اللہ نے رفتہ رفتہ اپنے لئے ایک منفرد راہ ڈھونڈ نکالی۔ انہوں نے اپنی کہانیوں کے لئے برصغیر کا جو حصہ چنا وہ آج کا بنگلہ دیش ہے۔ اس حصے سے وہ بخوبی واقف تھے اور یہاں کی دیہی زندگی کے بارے میں ان کا مشاہدہ بہت گہرا اور وسیع ہے جب وہ یہاں کے غریب عوام کی زندگی کی عکاسی کرتے ہیں تو جذبات اور تخیلی عناصر کی بجائے حقیقت نگاری کا سہارا لیتے ہیں اور یہ حقیقت نگاری بہت پُر اثر ہے۔

پچھلی نصف صدی میں افسانے اور ناول نگاری کا معیار برصغیر کے ادب میں خاصا بلند رہا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں شاہکار افسانوں اور ناولوں کی تعداد اُردو سے زیادہ

بنگلہ ادب میں ملتی ہے۔ بنگالی افسانوں اور ناولوں کا بغور مطالعہ کریں تو بہت سے پہلو ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ ایسے پہلو اور ایسی خصوصیات جو انہیں برصغیر کی دوسری زبانوں میں میں لکھے جانے والے ادب سے ممیّز کرتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کے اکثر ادیبوں کو کہانی سنانے کا ڈھنگ آتا ہے۔ آج بھی ان کے یہاں پلاٹ کو اہمیت حاصل ہے۔ میں ان کے فن کے اس پہلو کو اہمیت دیتا ہوں کیونکہ میری رائے میں بغیر مناسب پلاٹ کے نہ افسانہ، افسانہ رہتا ہے اور نہ ناول، ناول۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ بنگالی ادیبوں کے یہاں علامتوں کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ آسان علامتیں اور استعارات ان کے یہاں بھی ملتے ہیں جو یہ ظاہر کرتے ہیں کہ انسان کو زندہ رہنے کے لئے اپنی نجات کے لئے کیسے کیسے امتحانوں سے، کیسے کیسے دشوار گزار مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ مسلم بنگال کے کینوس پر لکھے گئے ادب میں ہمیں بہت سی باتیں مشترک نظر آتی ہیں۔ دیہات کے مسلمان سادہ لوح بھی ہیں، ساتھ ہی کم علم اور غریب بھی، اس لئے ان پر ہر دور میں فقیروں، پیروں اور علمائے دین کا اثر رہا ہے۔ مزاروں اور خانقاہوں سے عموماً انہیں بڑی عقیدت ہوتی ہے اور ان کی اکثریت کو یہ یقین ہوتا ہے کہ ان مزاروں میں دفن بزرگوں کی وساطت سے ان کی دعائیں خدا تک آسانی سے پہنچ سکتی ہیں۔ میں یہاں مسلم بنگال کے چند بڑے شہروں کے مسلمانوں کا ذکر نہیں کر رہا ہوں بلکہ ان لاکھوں مسلمانوں کا جو ہزاروں دیہاتوں اور چھوٹے شہروں میں صدیوں سے آباد ہیں اور صدیوں ہی سے ایک ہی طرح کے اعتقادات اور پیچیدہ معاشی اور سماجی مسائل کے زیر اثر ہیں۔

اپنے دوسرے ہم عصر معروف بنگالی ادیبوں مثلاً شوکت عثمان اور منیر چودہری وغیرہ میں سید ولی اللہ مجھے اس لئے منفرد نظر آتے ہیں کیونکہ ان دانشوروں کے برعکس ان کے یہاں اندازِ بیان میں بھی اور موضوعاتی اعتبار سے بھی بڑا دھیما پن ہے۔ ان کا ایک خاص اسلوب ہے۔ وہ اپنی اکثر تحریروں میں سادہ بیانی اور بیانیہ طرزِ تحریر کو ترجیح دیتے ہیں۔ انسانی زندگی کے مختلف معاشی، معاشرتی اور جذباتی مسائل اور فطرت کی پیچیدگیوں کی ان کے یہاں بھرپور عکاسی ہوتی ہے۔ ان سے پیدا ہونے والے تکلیف دہ اثرات کی ان کی کہانیوں میں واضح جھلک ملتی ہیں۔ وہ نچلے طبقے کے انسانوں کے جذبات اور احساسات کی بڑی عمدگی سے ترجمانی کرتے ہیں۔

''بے جڑ کا درخت'' ایک ذہین شخص، مجید کی کہانی ہے۔ وہ غمِ روزگار سے گھبرا

کر محبت پور نامی گاؤں میں پناہ لیتا ہے۔ وہاں اسے ایک قدیم قبر نظر آتی ہے۔ جس کے بارے میں کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کس کی ہے۔ وہ اس قبر کا سہارا لیتا ہے۔ اسے ایک قدیم ولی اللہ کا مزار ظاہر کرتا ہے اور پھر اس کا مجاور بن کر مکر اور فریب کا چکر چلا کر علاقے کا صوفی بزرگ بن بیٹھتا ہے۔ اسے ہر طرح کا چین اور سکون ملتا ہے۔ لیکن آخر کار اس کی زندگی میں ایک ایسا وقت بھی آتا ہے جب اسے تن تنہا اپنی قسمت کے لکھے کو قبول کرنا پڑتا ہے۔

ہر انسان کے ساتھ بہت سی الجھنیں ہوتی ہیں، بہت سے مسائل ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود زمین سے اس کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کا احساس جتنا ایک کسان کو یا کسی دیہاتی کو ہوتا ہے اتنا شہر والوں کو نہیں۔ اسی لئے کسان زمین سے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی اپنی ماں سے۔ اسے نقصان پہنچانا اس کے لئے ممکن نہیں۔ اسے خیر باد کہنا اس سے رشتہ توڑ کر دور چلے جانے کا تصور اس کے لئے بڑا جان لیوا ہوتا ہے۔ ''بے جڑ کا درخت'' کا مجید بھی، نام نہاد عالمِ دین اور صوفی بننے سے پہلے ایک غریب دیہاتی تھا۔ اس لئے جب مزار کے آس پاس کا علاقہ ایک تباہ کن سیلاب کا شکار ہو جاتا ہے اور سیلاب کا پانی مزار اور اس کے گھر کی طرف تیزی سے بڑھنے لگتا ہے۔ تو اسے احساس ہو جاتا ہے کہ اب کوئی طاقت اسے نہیں بچا سکتی۔ وہاں کے زمیندار کا گھر ایسا ہے جو پہاڑی پر ہونے کی وجہ سے محفوظ ہے، وہ اپنے خاندان کو زمیندار کی حویلی میں پہنچا کر، اپنے لئے جو راستہ اختیار کرتا ہے وہ اس کی سوچ کی بڑی عمدہ غمازی کرتا ہے۔ اس کی زندگی کے اس پریشان کن موڑ پر، وہ کیا سوچ رہا ہے اور آخر کار کیا فیصلہ کرتا ہے؟ اسے ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے؟

> ''میں اس زمین کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟...... یہ میرا گھر ہے جو میری اپنی محنت سے بنا ہے۔ مانا کہ میں اجنبی کے طور پر ملک کے اس حصے میں آیا تھا لیکن اب یہ علاقہ میرا وطن بن چکا ہے...... یہ گھر اور اس کی سلوٹوں والی ٹین کی خوبصورت چھت جو دھوپ میں چمکتی ہے...... یہ وسیع صحن جس کے چاروں طرف نفاست سے کاٹے ہوئے بانسوں کی دیوار ہے...... یہ خوشگوار جوہڑ جس میں کئی قسم کی مچھلیاں ہیں اور بانس کا پردہ ہے، جس میں، مَیں اور میرے گھر

والے خلوت میں نہاتے ہیں...... یہ مزار اور اس کی شاندار سجاوٹیں
جہاں میں نے عبادت اور غور وفکر میں کئی گھنٹے بسر کئے ہیں۔ یہ سب
کچھ میرا ہے۔اب اگر یہ سب کچھ غرق بھی ہو جائے تو بھی میں اس
جگہ کو کیسے چھوڑ سکتا ہوں؟''

جب مجید اپنے خاندان کو محفوظ جگہ پہنچا کر واپس آ رہا ہے تو اس وقت بھی اس کی سوچ کا انداز اس کے عزائم اور اس کا لائحہ عمل ایسے ہی ہیں۔ان پریشان کن حالات میں بھی اس کے قدم بالکل نہیں ڈگمگاتے۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ اپنی منزل کی طرف بڑھتا ہے۔ان خیالات واحساسات کے ساتھ:

''اکیلے گھر آنے کا فیصلہ کو اس نے کیا تھا اس میں نہ تو بہادری کا
کوئی احساس تھا اور نہ غصے یا ضد کا کوئی عنصر۔ وہ کوئی بھی جذبہ
محسوس نہیں کر رہا تھا۔کسی دلیرانہ کارنامے کا اسے کوئی احساس نہیں
تھا۔صرف چند گھنٹے پہلے اس نے اس بات کے مناسب جواز تلاش
کر لئے تھے کہ اسے سیلاب آنے کی صورت میں بھی گھر ہی مَیں رہنا
چاہیے۔ یہ اس کا گھر تھا، جو اس نے برسوں کی جان توڑ محنت،
بھوک اور مایوسی کے بعد حاصل کیا تھا''۔

مجید کی پہلی بیوی رحیمہ، لمبی چوڑی بھاری بھرکم عورت ہے، جب وہ چلتی تو اس کے قدموں کی آواز صاف سنائی دیتی۔ایک دن وہ صحن میں اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف تھی تو مجید نے اسے مشورہ دیا:

''اسی طرح نہ چلا کرو بی بی۔اس سے زمین کو تکلیف پہنچتی ہے زمین
کو یہ انداز پسند نہیں۔اس میں توہین کا پہلو ہے۔یاد رکھو۔ایک نہ
ایک دن سب کو اس زمین میں جاملنا ہے''۔

یہاں بھی زمین سے انسان کے گہرے رشتے کی، اس سے عقیدت کی واضح جھلک ملتی ہے۔سید ولی اللہ جس انداز سے مناظر فطرت بیان کرتے ہیں اور جس طرح ان کا یہ ناول شروع ہوتا ہے، اسے پڑھ کر لگتا ہے، ان کی کہانی کا مرکزی کردار بے بس انسان نہیں، وہ زمین ہے جس پر وہ پیدا ہوتا ہے اور پھر زندہ رہنے کے لئے جدوجہد کرتا ہے، قدرتی عناصر سے نبرد آزما رہتا ہے اور آخر کو اس کے ساتھ جو کچھ ہوتا ہے اسے

مشیت ایزدی سمجھ کر قبول کر لیتا ہے۔

سید ولی اللہ کے یہاں نصیحتیں اور بیان بازی بالکل نہیں ہوتی۔ چونکہ ان کا اندازِ بیان سادہ ہوتا ہے اس لئے مجھے یقین ہے بنگلہ سے، یا اس کے انگریزی ترجمے سے ناول کو اردو کے قالب میں ڈھالتے ہوئے اس کی روح کی حفاظت کرتے ہوئے، مصنف کے فلسفے کو اردو تحریر میں جذب کرنے میں مترجم کو کوئی دقّت نہیں ہوئی ہوگی۔ اس کا ثبوت یہ ترجمہ ہے جو بڑی حد تک سلیس ہے۔ ترجمہ اتنا رواں اور غیر مبہم ہے کہ اس سے سید ولی اللہ کے فن اور طرزِ تحریر کی بڑی اچھی عکاسی ہوتی ہے۔ بنگلہ میں جس طرح کی جزئیات نگاری ہوتی ہے اس کی دلکش جھلکیاں بھی اردو ترجمے میں جا بجا نظر آتی ہیں۔ بعض جگہ تو یوں لگتا ہے جیسے ہم خود اس ناول کے جیتے جاگتے کردار ہوں۔

بنگلہ میں اسی انداز کی اور کئی کتابیں لکھی گئی ہیں جن میں انسان اور زمین کے رشتے کا کئی مختلف انداز میں ذکر آیا ہے کیونکہ بنگال کی بہت بڑی آبادی دیہاتوں میں رہتی ہے اور گزر بسر کے لئے زمین ہی کا سہارا لیتی ہے۔ اردو، سندھی اور پاکستان کی دوسری علاقائی زبانوں میں بھی اس موضوع پر خاصا لکھا گیا ہے۔ لیکن ان میں ''بے جڑ کا درخت'' کا شدتِ احساس کم ملتا ہے۔ اس لئے اردو دان طبقے کے لئے میں اس ناول کو ایک منفرد تخلیق سمجھتا ہوں، کیونکہ اس کے مصنف نے زندگی اور کائنات کی مروجہ زایوں سے ہٹ کر، اپنے خطے کے غریب سادہ لوح عوام کے مسائل کو دیکھنے کی کوششیں کی ہیں...... ''بے جڑ کا درخت'' اردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔

انور عنایت اللہ

کراچی

MashalBooks.com

باب نمبر 1

بے پناہ خلقت اس دھرتی پر آباد ہے۔ اس لٹی پٹی دھرتی پر جو اَب بانجھ بن چکی ہے۔

لوگوں کو اس کا احساس ہے۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتے ہیں؟ اس کے چپے چپے پر ہل چلایا جاتا ہے۔ بوائی کی جاتی ہے۔ سال میں تین بار دھان کی تین فصلیں لینے کے لئے اور پھر پٹ سن کی خاطر جو واحد نقد جنس ہے۔ دوسری چیزیں بھی ہیں...... گنا السی کے بیج، سرسوں، تلی اور سویا بین۔ سال بھر ہر روز صبح سے شام تک اس دھرتی پر بار بار ہل چلایا جاتا ہے اور فصل بوئی جاتی ہے۔ اس کے مقدر میں آرام اور سکون نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اس کی نشو ونما کا کوئی سامان نہیں۔ کم از کم ان پیٹ بھروں کی طرف سے تو نہیں جو اس کا خون چوس رہے ہیں۔ ہاں بس سیلاب زدہ دریاؤں کی گادہی اس کی غذا ہے۔ وہ خوب جانتے ہیں لیکن وہ ہیں اس قدر زیادہ۔ کھانے والوں کا ہجوم بے پناہ اور زمین کم۔ دھرتی کو جتنا نچوڑ سکتے ہیں نچوڑتے ہیں پھر بھی بھوکے کے بھوکے۔ ایسے لوگ اگر ناآسودگی کا شکار ہوں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ چٹانوں، پتھروں اور کنکروں سے پاک نیلے آسمان اور سبز کھیتوں کا یہ گنجان علاقہ آسودگی اور شانتی سے محروم ہے۔ وہ تو بے چینی اور بے کلی کا مارا ہوا ہے۔ اور وہ سب کے سب اس فکر میں مبتلا رہتے ہیں کہ اس سے پہلے کہ پانی سر سے اونچا ہو جائے اپنے اپنے گھروں کو خیر آباد کہیں۔ اور ان علاقوں کی طرف نکل جائیں جہاں انہیں دن میں صرف ایک بار کھانے کو پیٹ کی آگ بجھانے کو کچھ مل جایا کرے۔ وہ ایسی زمینوں کے خواب دیکھتے ہیں جہاں انہیں یہ پتہ ہو کہ وہ کیوں صبح کو اٹھتے ہیں اور رات گئے کیوں جاگتے رہتے ہیں یہاں تو کچھ بھی نہیں اور اگر کچھ مل بھی جائے تو ایسے ہی ہے جیسے آگ پر تیل کی بوند گر پڑے۔ سب کچھ کھا جانے والی بھوک کی آگ جو کبھی سرد

MashalBooks.com